

جناب ضیاء الدین لاہوری

تذکرہ ہائے سر سید میں تضاد اور بددیانتی کی چند مثالیں

مطالعہ سر سید کے دوران میں بعض ایسے مقامات آتے ہیں جہاں قاری سخت الجھن میں پڑ جاتا ہے وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ مضمون نگار یا مولف کی زیر مطالعہ باتوں پر یقین کرے یا اس کی کسی دوسرے موقع کی متضاد تحریر کو سچ مانے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی خاص مسئلے کے ضمن میں سر سید کے ”کارنامے“ کے طور پر بیان کردہ اسکا تجزیہ درست ہے یا اس ”کارنامے“ کے رد میں سر سید کا بیان قابل قبول ہے۔ جب وہ قوی نقطہ نظر سے لکھی گئی تاریخ کی باتوں کا سر سید کے اقوال و اعمال کے ساتھ موازنہ کرتا ہے تو انہیں ایک دوسرے کی ضد پا کر پریشان ہو جاتا ہے۔ میں اپنے تعلیمی نصاب کے شکار اس معصوم قاری کی بات نہیں کر رہا جو ہمارے موجودہ تعلیمی ماحول میں مخصوص حلقوں کی ہر بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے، میرا مطلب اس قاری سے ہے جو مطالعہ کرتے ہوئے اپنے ذہن سے ”ہاں“ اپنے ذہن سے ”سوچتا ہے اور موضوعات سے متعلق سیاق و سباق کو بھی مد نظر رکھتا ہے۔ مگر چونکہ وہ بھی تعلیمی نصاب کی تکمیل کے مراحل سے گزر کر اس مقام تک پہنچا ہے اور یوں اجتماعی ذہنی دھلائی کے غیر محسوس عمل کے زیر اثر بھی رہا ہے اس لئے آزادانہ سوچ کے آغاز میں اس کی پریشانی ایک قدرتی امر ہے۔ یہ کیفیت اسے اصل مآخذ کی ورق گردانی پر آمادہ کرتی ہے اور تمام حالات پر غور کر کے وہ بالآخر حقائق تک پہنچ ہی جاتا ہے اس کے برعکس نصاب زدہ قاری اس تردد میں پڑنے کی زحمت گوارا کرتا ضیاع اوقات سمجھتا ہے اور کولہو کے بیل کی مانند موجودہ نصاب کے کھونٹے کے گرد چکر لگاتے رہنے ہی کو فخر سمجھتا ہے۔ سہل پسندی اسے تحقیق کی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ اگر وہ اپنا نام خود ساختہ دانشوروں کی فہرست میں شامل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کا تعصب مزید قوی ہو جاتا ہے اس صورت میں اس کے سامنے بے شک حقائق کا انبار لگا دیا جائے، وہ اپنے تعصب کو ذہن سے نہیں نکالتا بلکہ رٹے رٹائے جملوں سے ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ سر سید احمد خان کی شخصیت اور ان کے افکار پر بے شمار مقالے لکھتا ہے، کتابیں تالیف کرتا ہے مگر انکی اہم تصانیف کا مطالعہ تو کجا انہیں ہاتھ لگانے کی بھی نوبت نہیں آنے دیتا کیونکہ اس موضوع پر جو کچھ اس کے ذہن میں پختہ ہو چکا ہے وہی اس کا علم اول تا آخر ہے وہ اسے ہی مکمل سمجھتا ہے اور مزید مطالعے کو اپنی توہین سمجھتا ہے لہذا اس کی تمام ”تحقیقات“ الفاظ کے الٹ پھیر سے گھوم پھر کر ایک ہی مخصوص نکتے پر آن جمع ہوتی ہیں۔ اس کا محدود علم ہی اس کی داس وری کی جیاد ہے اس لئے وہ حقائق قبول کرے اپنی دانش وری کو داؤ پر نہیں

لگا سکتا۔ اسے خدشہ ہوتا ہے کہ اس طرح اسے اپنی سبقت تحریروں کا رد کرنا پڑے گا اور اسکی ”قدر و قیمت“ نہیں رہے گی۔ حقائق کو قبول نہ کرنے کے سبب اس کی تحریروں میں تضاد جنم لیتا ہے مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لاعلم رہنے ہی میں اپنی ”عافیت“ سمجھتا ہے یا پھر ”میں نہ مانوں“ کی گردان الاپتار ہوتا ہے۔

سر سید احمد خان کی شخصیت انکے بعض اختلافی تعلیمی و سیاسی افکار اور مذہبی عقائد کے باعث انکے عہد ہی سے متنازعہ فیہ چلی آرہی ہے انکے پرستار اہل قلم افراد کی جذباتی تحریروں نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کو بڑی طرح متاثر کر رکھا ہے۔ بعض نامور اساتذہ اور معروف دانش ور اپنے لیکچروں اور مقالوں میں انکے متنازعہ کردار کے بارے میں لفاظی کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ اصل مسئلہ دبا دیا جاتا ہے اور صرف ہمدردانہ جذبات ابھارے جاتے ہیں۔ وہ علمی دلائل تسلیم نہیں کرتے بلکہ محض عقیدت کے سہارے مفروضے قائم کرتے ہیں۔ یہ رویہ موجودہ دور میں ہی نہیں اپنایا گیا، ہم اسے سر سید کے رفقا میں بھی موجود پاتے ہیں۔ ذیل میں چند مشہور شخصیات اور مصنفین کی تقریروں اور تحریروں سے وہ اقتباس پیش کئے جاتے ہیں جن میں واضح طور پر تضاد پایا جاتا ہے۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

ہمارے بعض قلم کار جب شخصیت پرستی کے زیر اثر مطالعے کے بغیر قلم اٹھاتے ہیں تو بعض اوقات تخیلاتی واقعات کو جنم دیتے ہیں اور ایسے قصے بیان کرتے ہیں جن کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ گھڑنے سے انکا مقصد پورا ہو جائے گا حالانکہ اس طرح خود انکی اپنی ”قابلیت“ کا بھانڈا پچ چور ہے کے پھوٹتا ہے۔ نظریاتی کشمکش میں نام پیدا کرنے کے شوقین ایک نامور اہل قلم ”پروفیسر رفیع الدین شہاب“ کی ایک تحریر میں اسی قسم کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ آپ نے سر سید کی تفسیر القرآن کی اشاعت نوکا اہتمام کیا تو اس کے تعارف میں سر سید کی کتاب ”اسباب بغاوت ہند“ کے متعلق لکھا:

”اس کتاب کے لکھنے پر انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی، لیکن چونکہ یہ کتاب حقائق پر مبنی تھی اسلئے انگلستان کے بعض انسان دوست انگریزوں نے کوشش کر کے انکی یہ سزا معاف کرا دی“ (۱)

شاید موصوف کو یہ علم نہیں کہ نہ سر سید کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور نہ ان پر کسی قسم کا کوئی مقدمہ قائم ہوا، یہاں تک کہ اس سلسلے میں کبھی ان سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوئی سزا معاف کروانے والے انگلستان کے انسان دوست انگریز اس قصے میں یونہی گھسیدوئے گئے۔ خدا جانے انہوں نے کس اثر کے تحت یہ حکایت تخلیق کر ڈالی؟ اس کتاب کی اشاعت پر ”زیادہ سے زیادہ“ جو رد عمل ہوا، وہ سر سید کے معتمد اعلیٰ الطاف حسین حالی کے درج ذیل الفاظ میں حقیقت حال کی خوبی و وضاحت کرتا ہے:

”ورنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کینگسٹون نے جزل اور سرباز فریر نے ’جو کونسل میں ممبر تھے اس کے‘ معمول کو مصلحتاً اس پر ہونے والی سرسری بحث میں نے ’جو اس وقت فارن

نیکر ٹری تھے، اس کے خلاف بہت بڑی پہنچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اسے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے۔ لیکن چونکہ اور کوئی ممبر انکام رائے نہ تھا۔ اس لئے اگلی پہنچ سے کوئی مضرتیبہ پیدا نہیں ہوا۔“ (۲)

جب وقت کا گورنر جنرل ”اسباب بغاوت ہند“ کے مضمون کو محض خیر خواہی پر مبنی کر رہا تھا اور کونسل کا کوئی بھی رکن صرف ایک اہل کار کی ”غضب ناک تقریر“ کا ہم نوائہ تھا تو انہیں کون نقصان پہنچا سکتا تھا؟ انکے برعکس ہمارے پیشہ ور اہل قلم سرسید کے متعلق متذکرہ بے ضرر مخالفانہ رائے کو جیاد بنا کر اپنے مضامین میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ اس کتاب کی اشاعت پر انگریز حکمران ان کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔

آگے چل کر پروفیسر صاحب نے علمائے دین کی علمی چوریاں پکڑنے کا دعویٰ کیا ہے اور ایک چوری کا انکشاف ان الفاظ میں کیا ہے :

”مسئلہ جبر و قدر.... پر مودودی صاحب کا کتابچہ ”مسئلہ جبر و قدر“ شائع ہوا تو اسکی بڑی تعریف کی گئی حالانکہ مودودی صاحب نے اسے لفظ بہ لفظ سرسید احمد خان صاحب کی تفسیر سے نقل کیا تھا۔ بس اس میں یہ اضافہ کیا تھا کہ کتابچے کے شروع میں اسکی تائید و مخالفت میں پیش کی جانے والی آیات کو نقل کر دیا لیکن جب اصل مسئلہ پیش کیا گیا تو وہ لفظ بہ لفظ وہی تھا جو سرسید احمد خان صاحب نے پیش کیا تھا۔“ (۳)

اس الزام کی حقیقت جاننے کے لئے حساس قارئین نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متذکرہ کتابچے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ دیگر قارئین بھی پروفیسر صاحب کا ہر آئد کردہ چوری کا مال ”لفظ بہ لفظ“ دیکھنے کے شدت سے متمنی ہیں۔ فاضل مدعی کو چاہیے تھا کہ بغیر ثبوت بات کرنے کی بجائے بطور نشان دہی اپنے دعویٰ کا کوئی ہلکا سا حوالہ پیش کر دیتے کیونکہ شہادت کے بغیر کوئی الزام ذرا بھی وقعت نہیں رکھتا بلکہ ”تمہمت کے زمرے میں آتا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اسی ”تعارف“ میں ایک اور انکشاف کیا ہے کہ سرسید نے :

”انصوت کے مشہور عالم دین شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ سے فتویٰ دلویا کہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا گناہ نہیں۔“ (۴)

جناب سلیم منصور خالد نے ایک مجلہ میں اگلی اس تحقیق پر یہ رائے دی :

”پروفیسر رفیع اللہ شاہب کی اس نادروزرگار تحقیق پر داد نہ دینا ظلم ہے۔ سید احمد خان 1817ء میں پیدا ہوئے اور جب وہ سات برس کے تھے تو شاہ عبدالعزیز دہلوی لمن شاہ ولی اللہ فوت ہوئے۔ انکار حدیث کے قلم بھٹ لکھاری کی چشم تنخیل نے سات برس کے سید احمد کے ہاتھوں شاہ عبدالعزیز کو فتویٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ تحقیق، تنخیل اور خواہشات کی اسارت کا یہ نمونہ خاصے کی جڑ ہے۔“ (۵)

درج بالا تبصرے کی اشاعت کے بعد متذکرہ تفسیر کی اگلی اشاعت میں فتوے سے متعلق عبارت کو ان الفاظ میں تبدیل کر دیا گیا۔

”انہوں نے شاہ عبدالعزیز دہلوی سے فتویٰ دلویا کہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا گناہ

نہیں۔“ (۶)

مزنے کی بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف کے ”تعارف“ کی تحریر جو یک اگست 1994ء کی لکھی ہوئی ہے اگلی اشاعت میں بھی وہی رہی مگر اس میں جو تبدیلی کی گئی گوا اسکے بعد کی ہے مگر وہ بھی اس تاریخ کی لکھی ہوئی ظاہر کی گئی ہے۔ دیانت داری کا تقاضا تھا کہ اسے تبدیل کرتے ہوئے حاشیے میں اس امر کی وضاحت کی جاتی اور اپنی غلطی تسلیم کی جاتی۔ اسکے برعکس دیکھا جائے تو موصوف کے مدوح اس معاملے میں نہایت عالی ظرف واقع ہوئے تھے۔ انکی اس صفت کی ایک مثال حاضر ہے۔ سرسید اپنی ایک علمی غلطی کا اقرار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’ابطال غلامی کا آرٹیکل جو تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں چھپا ہے اور جس کا نام ”تہذیب الاسلام عن شین الامة والغلام“ ہے اس آرٹیکل میں ایک بڑی غلطی ہم سے ہو گئی ہے یعنی اس کے باب ہفتم میں بہ ذیل بیان ازواج مطہرات کے ہم نے ایک حدیث صحیح مسلم سے ’نسبت حضرت جویریہ کے نقل کی ہے۔ افسوس ہے کہ جس کتاب سے ہم نے حدیث کو نقل کیا‘ اس میں غلطی تھی۔۔۔۔۔ افسوس ہے کہ ہم نے اپنی جمالت سے اسی غلط عبارت کی پیروی کی۔ اسی کو نقل کیا اور اسی کو بطور ایک اختلاف کے لکھ دیا۔ پس ہم اس خطا کو اور اپنی جمالت کا اقرار کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ہم اپنے شفیق مولوی علی حش خان صاحب سب آرڈینیٹ جج گورکھ پور کا شکر ادا کرتے ہیں۔ جن کے فرمانے سے ہم اس غلطی سے متنبہ ہوئے۔“ (۷)

واضح ہو کہ مولوی علی حش خان سرسید کے سب سے بڑے دو مخالفین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے حرمین شریفین جا کر سرسید کے خلاف کفر کے فتوے جاری کروائے۔ یہاں سرسید نے اپنی غلطی کا اقرار جن الفاظ میں کیا اسے پڑھ کر رشک آتا ہے۔ کاش ان کے معتقد ایسی صورت حال میں ان کی ہلکی سی تقلید کا کوئی نمونہ پیش کر کے اپنی قابل احترام شخصیت کی روح کو سکون پہنچاتے!

ڈاکٹر فوق کریبی:

”اسباب بغاوت ہند“ مطبوعہ 1985ء میں ڈاکٹر فوق کریبی کے مقدمہ کے آخر میں درج ذیل

عبارات تحریر ہے

”1915ء میں جب گاندھی جی کا عرس میں شریک ہوئے تو انکے دل میں مسلمانوں کیلئے بڑی وسعت تھی۔ وہ حق بات کہنے کے باعث ہمیشہ فرق پرست کانگریسیوں کی نظر میں ٹھکتے رہے اور 1920ء میں جب مسلمانوں کی طرف سے خلافت تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک نے حکومت کے خلاف بدیشی مال کا بیانات اور انگریزی حکومت کی نوکریوں سے مستعفی ہونے کا پروگرام بنایا تو مسلمانوں نے اس تحریک میں گاندھی جی کو اپنا رہنما بنا کر مہاتما گاندھی کا لقب دیا اور گاندھی جی اور مسلم رہنماؤں کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگریس میں ایسا اتحاد پیدا ہو گیا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ایسے بھائی بھائی ہوئے کہ مسلمانوں نے مہاتما گاندھی اور شروہانند جیسے آریہ سماج لیڈر کو اپنے کانڈھوں پر اٹھا کر دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا کر کے ان کی تقریر بھی سنی۔ لیکن بد قسمتی سے خلافت کمیٹی نے

عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ 1947ء میں ملک آزاد ہو گیا اور انگریز کا پرچم لال قلعہ سے اتار کر کانگریس کا سر رنگی قومی پرچم لہرا دیا گیا جو اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ ہندوستان کی عظمت و بلندی کی نشاندہی کر رہا ہے۔ سرسید نے ”اسباب بغاوت ہند“ 126 سال قبل لکھ کر ہندوستانوں کو جو آزاد پارلیمنٹ کا خواب دکھایا تھا آج اس کی جیتی جاگتی تصویر آزاد ہندوستان کا پارلیمنٹ ہے۔ آج اس میں سرسید کے ہول خود ہندوستانی بناتے ہیں اور خود اس پر عمل کرتے ہیں۔“ (۸)

اسی کتاب کا فوٹو سنٹیٹ ایڈیشن 1991ء کے حوالے سے پاکستان میں طبع ہوا تو اس میں درج بالا تحریر کو اس طرح بدل دیا گیا:

”لیکن تقسیم سے پہلے کانگریس کے ارباب اقتدار نے آزادی کے بعد سرسید کے جداگانہ انتخاب کے نعرہ کو باقاعدہ اپنا کر نہ صرف اسے دستور کی حیثیت دی بلکہ دستور ساز اسمبلیوں میں ریزرویشن کے ذریعہ نمائندے بھی لے گئے اور انہیں سرکاری ملازمین میں ریزرویشن بھی دیا گیا۔ آج ہندوستان کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کے افراد حکومت سے اپنے اپنے لئے جداگانہ ریزرویشن اور جداگانہ ملازمتوں کی مانگ کر رہے ہیں۔ سرسید نے ”اسباب بغاوت ہند“ 132 سال قبل لکھ کر حکومت سے یہ شکایت کی تھی کہ ہندوستانوں کو مجسٹینو کو نسل میں نمائندگی نہیں دی جاتی اور نہ انہیں سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدے دئے جاتے ہیں۔ حکومت نے سرسید کی دونوں باتوں کو تسلیم کیا اور سرسید نے یہ بھی پیش گوئی کی تھی کہ وقت آئے گا جب تم اس ملک کا خود قانون بناؤ گے اور خود اس پر عمل کرو گے۔ آج ہندوستان میں قانون ساز مجلس سرسید کی پیش گوئی کی منہ بالی تھی۔“ (۹)

چھپن صفحات کے مقدمہ میں محض چند سطروں کی عبارت میں تبدیلی کا پس منظر لیا ہے؟ کیا عبارت اول فاضل مصنف کے قومی مسلک کے مطابق نہیں تھی یا پھر انہوں نے ”گنگا گئے تو گنگا رام اور جہنا گئے تو جہنا داس“ کی ضرب اللش کی پیروی کی؟ بہر حال یہ واقعی بڑی کلر گیری کی بات ہے۔ کہ ایک مصنف اپنی پسندیدہ لیکن متنازع شخصیت کو تسلیم کروانے کے لئے دو قوموں کے متضاد قومی اور جذباتی ذہنوں کے مطابق جدا جدا اوزاروں سے کام لے! اسی طرح سرسید کے نظریہ قومیت کے بارے میں ڈاکٹر فوق کریم کی تحریروں میں بہت بڑا تضاد ملتا ہے۔ انہوں نے 1958ء میں ”اسباب بغاوت ہند“ کی اشاعت اول کا اقتساب ان الفاظ میں تحریر کیا:

”سرسید کی روح کے نام جس نے ہندوستانوں کو متحدہ قومیت کا درس دیا۔“ (۱۰)

لیکن 1985ء میں اپنے مقدمے میں ایک جگہ اسکے برعکس یوں لکھا:

”سرسید جو ہندو اور مسلمانوں کو اپنی ایک آنکھ اور ہندوستان کو ایک دل من سے تشبیہ دیتے تھے دوسرے انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم بنا دیا لیکن جب بیابان میں کچھ ہندوؤں نے اردو کے خلاف آواز بلند کی تو ان کے دل کو اس آواز اور تحریک سے سخت چوٹ پہنچی جس نے سرسید کے متحدہ قومیت کے نعرے کو متزلزل کر دیا۔“ (۱۱)

یہ لکھتے ہوئے موصوف بھول گئے کہ انہوں نے ایڈیشن اول کے مقدمہ میں متحدہ قومیت کے حق میں کئی صفحات پر مشتمل سرسید کے جن تقریروں کے اقتباسات پیش کئے تھے۔ وہ انہوں نے 1884ء میں پنجاب کے سفر کے موقع پر کی تھیں۔ بہار کا واقعہ 1867ء کی بات ہے۔ بعد ازاں سے سرسید نے ۱۸ سال بعد کے متحدہ قومیت

کے حق میں نعرے، سترہ سال قبل کیسے متزلزل ہو گئے؟ تضاد سے یہ اس فلسفہ پر سرسید کے شیدائی ہی کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں!

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ :

سرسید کی ایک نہایت عقیدت مند شخصیت خان بہادر ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ نے ”سرسید کا مذہب“ کے عنوان سے سرسید کی وفات کے موقع کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

”..... میں یہ بھی شہادت دیتا ہوں کہ جب انکا وصال ہوا تو جنازے کی نماز میں کالج کے طلبہ اور علی گڑھ شہر کے بہت سے لوگ آکر شریک ہوئے۔ ایک شخص جلدی سے ہمارے ایک عالم مولوی الطاف علی کے پاس آئے (مولوی الطاف علی صاحب ہمارے سکول میں معلم تھے) اور ان سے دریافت کیا کہ ”سرسید پر کفر کا فتویٰ لگا ہوا ہے ان کے جنازے کی نماز حرام۔ آپ نماز میں شریک ہونگے یا نہیں اور مجھے کیا رائے دیتے ہیں؟“ مولوی الطاف علی صاحب نے فرمایا کہ ”سرسید نہایت بکے مسلمان تھے اور شاہ غلام علی دہلوی کے مرید تھے۔ انکے جنازے کی نماز پڑھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔“ جس شخص نے سوال کیا تھا اس نے کہا کہ ”اگر سرسید شاہ غلام علی دہلوی کے مرید تھے تو میں ضرور نماز میں شریک ہو گا“ اور وہ فوراً صف میں کھڑا ہو گیا اور نماز جنازہ ادا کی۔“ (۱۲)

ان الفاظ پر ڈاکٹر شیخ عبداللہ کی تحریر ختم ہو جاتی ہے اس واقعہ کے بیان سے انہوں نے ایک تیسرے شخص کی زبانی قارئین کے ذہن میں یہ بات جمانا چاہی ہے کہ سرسید شاہ غلام علی کے مرید تھے۔ اس سے غالباً انکا مقصد ہے کہ اس طرح سرسید سے عوامی عقیدت کی راہ ہموار ہوگی۔ حیرت ہوتی ہے کہ سرسید سے براہ راست مراسم رکھنے والا شخص جو تذکرہ مضمون کے شروع میں مطبوعہ اپنے خط میں انکی ایک اہم رائے کا امین ہونے کا دعویٰ کرتا ہے انکے معاملے میں صحیح صورت حال سے اس قدر بے خبر بھی ہو سکتا ہے۔ سرسید نے خود اپنی تاریخ پیدائش 5 ذی الحجہ 1232ھ بتائی ہے (۱۳) جبکہ شاہ غلام علی کی تاریخ وفات 22 صفر 1240ھ بیان کی ہے (۱۴) یعنی اس وقت سرسید کی عمر صرف سات برس تھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں انہیں ایک نامور شیخ کا مرید ظاہر کرنے کا اعزاز عطا کرنا سرسید کے عقیدت مندوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے! مرید ہونا تو ایک طرف رہا! سرسید خود شاہ غلام علی سے اس عقیدت سے بھی انکار کرتے ہیں۔ جو ایک مرید کو مرشد کے ساتھ ہوتی ہے۔ حالی لکھتے ہیں :

”سرسید نے ایک دفعہ شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ”میں اس قسم کی عقیدت ہمیں مریدوں کو اپنے شیخ کے ساتھ ہوتی ہے، مجھ کو نہیں ہے لیکن نہایت قوی تصدیق اور رابطہ اخلاص میرے دل میں شاہ صاحب کے ساتھ اور میں چاہتا ہوں کہ میری لائف میں اس بات کی تصدیق کی جائے۔“ (۱۵)

اور حالی نے ان کی یہ آرزو ان کی سوانح میں پوری کر دی مگر ان سے قریبی تعلق رکھنے والے بعض شیدائی

ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ کوثر :

سر سید پرست قلم کار سر سید کے بعض فقرات کے نت نئے مفہوم وضع کرنے میں خاصا ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کا ایک طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں تحقیقی تاثر پیدا کرنے کے لئے بعض بے ضرر حوالے صحیح طور پر بھی نقل کرتے ہیں۔ مگر جہاں انکے مدوح کی سوچ صریحاً منفی ثابت ہوتی ہو وہاں سیاق و سباق کی کانٹ چھانٹ کرنے کے علاوہ الفاظ کو تبدیل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ایسے مواقع پر وہ حوالوں کی صحیح نشان دہی نہیں کرتے بلکہ صرف کتاب کا نام لکھ کر اپنی دانشوری کا بھرم قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو زیادہ ”دیدہ دلیر“ ہوتے ہیں وہ تصوراتی پروازوں کے ذریعے سر سید کے منہ سے وہ کچھ اگلاتے ہیں جو انہوں نے کبھی نہیں کہا ہو تاہم ان کی فکر سے بالکل متضاد ہوتا ہے۔ اس کاروائی سے ان کا مقصود محض اپنے ہیر و کی پرستش کروانا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ کوثر نے اپنے ایک مقالے میں اس ”فن“ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ وہ ”اسباب بغاوت ہند“ کے حوالے سے سر سید کی ”مبینہ“ جرأت مندی کے خود ساختہ انکشافات منظر عام پر لائی ہیں۔ بات اپنی ہے مگر یوں بیان کرتی ہیں جیسے کہ یہ سب کچھ سر سید نے کہا ہو۔ قاری کو یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان کی میان کردہ توضیح دراصل سر سید کی سوچ اور انہی کے الفاظ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے :

”سر سید احمد خان نے سرکشی کا مفہوم واضح کیا کہ سرکشی کسے کہتے ہیں؟ اپنی حکومت کی اطاعت نہ کرنا اس سے مقابلہ کرنا اور گورنمنٹ کے اصول و قواعد کے خلاف عمل کرنا سرکشی ہے لیکن یہ حکومت ہندوستانوں کی اپنی نہ تھی بلکہ دھوکے اور فریب سے ان کے ملک پر قبضہ کیا گیا تھا لہذا آزادی کے حصول کی جدوجہد کو سرکشی نہیں کہا جاسکتا۔ گورنمنٹ کو ہندوستان اور ہندوستانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ ملک اور ہندوستانی عوام کو ہر لحاظ سے کمزور کرنا ان کا مقصد نظر آتا تھا۔ رعایا میں علمی روشنی عام کرنے کی بجائے جمالت کی تاریکی کو اپنی حکومت کے حق میں بہتر سمجھتے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ تعلیم عام کرنے سے ہندوستانوں میں سیاسی شعور پیدا ہو جائے۔ جو انکی حکومت کی پائیداری کے لئے خطرہ کا باعث ہو۔ اگر ہندوستانوں کو ذلیل سمجھتے تھے ان کی توہین کا کوئی پہلو تھا۔ جانے نہ دیتے تھے۔ سپاہیوں سے یہ کہنا کہ تم کانوں میں بالیاں نہ پھنساؤ، ڈاڑھی منڈاؤ، گڑی کی بجائے وردی کی ٹوپی پہنو، پھر چرچا والے کار تو سوں کا واقعہ جن کے متعلق ان کو یقین ہو چکا تھا کہ اس میں ہندو مسلم دونوں کے مذہبی نکتہ نظر کے خلاف گائے اور سوری کی جرمی استعمال کی گئی ہے، ان کار تو سوں کے استعمال پر بزدل طاقت اصرار کیا گیا لہذا کسی غاصب حاکم کے خلاف احتجاج کرنا سرکشی میں داخل نہیں جو زبردستی ان پر مسلط ہو گیا ہو۔“

”انہوں نے بتایا کہ ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں کو سرسمر نظر انداز کیا گیا جس سے ان میں بے چینی و بے اطمینانی کا پھیلنا یقینی تھا۔ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کا بھادشاہ ظفر کا ساتھ دینا ان کے اس شبہ کو تقویت دیتا تھا کہ مسلمان بھادشاہ ظفر کو بادشاہ بنا کر انگریزوں کو اس ملک سے نکال کر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سید احمد خان نے واضح کیا کہ اگر بادشاہ کے دل میں بادشاہت کی خواہش دوبارہ پیدا بھی ہوئی اور اسی نظریہ کے تحت انہوں نے حریت پسندوں کا ساتھ دیا ہو تو بھی اسے بغاوت نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ملک انکا تھا، حکم الہی تھا، انگریزوں نے غلط کیا، سرسمر نے غلط کیا، کھاتھار اور ہندوستانوں کیساتھ کبھی ہمدردی و انصاف کا رتاؤ نہ کیا تھا۔ کبھی انکی بہتری کو مد نظر نہ رکھا تھا بلکہ ہندوستانوں کو ذلیل سمجھا، ان کے اوپر قوانین بھی

ایسے مسلط کر دئے گئے تھے جو انکے مزاج، رسم و رواج اور ان کے مذہب و آئین کے خلاف تھے۔“ (۱۶)

درج بالا باتیں یا انکا ہلکا سا مفہوم بھی سرسید کی ”اسباب بغاوت ہند“ میں کہیں موجود نہیں۔ یہ سراسر ڈاکٹر صاحبہ کی ذہنی اختراع ہے جو ممکن ہے کہ انکے مقالے کے مشہور و معروف معاونین (جن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری سرفہرست ہیں) کے مشورے سے وجود میں آئی ہو۔ اسکے برعکس جب ہم اس تحریر کا سرسید کی فکر سے موازنہ کرتے ہیں تو سرسید کے درج ذیل بیانات محترمہ کی طرف سے ان پر ڈالی گئی ”گرد“ کو صاف کرنے کیلئے کافی ہیں :

”گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکرو فریب سے بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اسکے اصلی معنوں میں ضرورت تھی، سوا سی ضرورت نے ہندوستان کو انکا حکومت بنادیا۔“ (۱۷)

”وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی ایک ایسا زمانہ تھا کہ بے چاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اسکو ایک شوہر کی ضرورت تھی اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا..... انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی مگر مثل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے۔“ (۱۸)

”حق یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہایت شائستگی اور نرمی اور حفاظت مذاہب مختلفہ حکومت کی۔ اس کی حکومت میں بجز اس کے اور کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ بادشاہانہ حکومت نہ تھی اور جس کی بڑی ضرورت تھی کہ ہندوستان میں ہو۔“ (۱۹)

”اس پہچانہ (۱۸۵۷ء) میں کوئی بات مسلمانوں کے مذہب کے موافق نہیں ہوئی“ (۲۰)

دو قومی نظریے کی ابتداء سے متعلق ڈاکٹر صاحبہ مکتبہء فکر علی گڑھ کے مروجہ ”مکسوس“ فلسفے کی ترجمانی کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ سرسید ”ایک مدت تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم کہتے رہے۔“ اسکی تائید میں وہ پہلے سرسید کے ”آخری مضامین“ سے ان کے انتقال سے چند ماہ پیشتر جون ۱۸۹۷ء میں شائع ہونے والے مضمون سے ایک حوالہ پیش کرتی ہیں۔ پھر تیرہ سال پیچھے ہٹتے ہوئے اگلی ۱۸۸۳ء کی ایک تقریر کا اقتباس نقل کرتی ہیں۔ اسکے فوراً بعد مزید سترہ سال پیچھے جا کر بیان کرتی ہیں کہ :

”لیکن ۱۸۹۷ء میں ہندوؤں نے اردو دارسی رسم الخط کی جگہ ہندی دیوناگری رسم الخط کو جاری کرنے کا مطالبہ کر کے ہندوستانی قوم میں پھوٹ ڈال دی جس سے ”پہلی دفعہ“ ان کو یہ اندازہ ہوا کہ ہندو مسلم کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ اس لسانی تنازعہ نے نہ صرف فرقہ وارانہ منافرت و تفریق کو ہوادی بلکہ ہندوستان کی سیاسی سطح پر تفریق کا پہلا پتھر نصب کر دیا۔ یہیں سے دو قومی نظریہ کا آغاز ہوتا ہے۔“ (۲۱)

متذکرہ مکسوس فلسفے کا گمراہ کن انداز ”ایجاد“ کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا سہرا اور اصل علی گڑھ کے فکری ترجمان مولوی عبدالحق کے سر رکھا جاسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ انکے ”بے مغز دانش ور“ پیروکار اس فلسفہ کے غیر حقیقی پہلو کو سمجھنے کی بجائے اسکی تبلیغ میں جان بوجھ کر تمام

کو گمراہ کرنے کا ”فریضہ“ انجام دے رہے ہیں۔ انکے تتبع میں بہت سے غیر فکری، شوقیہ اور نصائی و غیر نصائی پیشہ ور قلم کار بھی شخصیت پرستی کے زیر اثر دانشی یا نادانشی میں اس غیر حقیقی توجہ کو جیاد بنا کر سر سید کو دو قومی نظریے کا خالق قرار دئے جا رہے ہیں جس سے یہ فلسفہ حیرت انگیز طور پر پوری قوم میں زہر کی طرح سرایت کر رہا ہے۔ موصوفہ کی تحریروں میں متعدد جگہ تضاد کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ وہ سر سید کی ملی خدمات ادا کرنے کی غرض سے تحریر کرتی ہیں :

”۱۸۸۸ء میں..... انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کی خاطر علیگڑھ میں یونیورسٹی پتھریٹک ایسوسی ایشن قائم کی۔“ (۲۲)

پھر ایک اور جگہ انکے قلم سے نادانشی میں جی بات بھی نکل جاتی ہے۔

”سر سید نے ایک جماعت یونیورسٹی پتھریٹک ایسوسی ایشن ۱۸۸۸ء میں (انجمن مہمان وطن کے نام سے) بنائی جس میں ہندو مسلم دونوں شریک تھے۔“ (۲۳)

جب حقائق کا علم بھی ہو تو کیا حوالہ اول کا بیان بددیانتی پر مبنی نہیں؟ کیا یقین کیا جاسکتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کی خاطر اس ایسوسی ایشن میں شرکت کی؟
رئیس احمد جعفری :

تضاد کی ایک واضح مثال رئیس احمد جعفری کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔ ”حیات محمد علی جناح“ میں ”عذر کے بعد پہلی آواز“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :-

”۱۸۵۷ء کے عالم آشوب عذر کے بعد مسلمانوں کی حالت حد درجہ یاس انگیز اور مایوس کن ہو گئی تھی، سهام انتقام کا ہدف انہی کا سینہ بنایا جا رہا تھا، ہندو اور انگریز دونوں ان سے جلع ہوئے تھے اور اپنے پچھلے فرضی اور واقعی قرضے چکارہے تھے۔ یہ حالت بیسویں صدی کے آغاز تک رہی۔ اس زمانہ میں نواب محسن الملک کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد شملہ پہنچا اور وائسرائے ہند کے سامنے اس نے ایک مفصل عرضداشت پیش کی..... وفد نے سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا تھا وہ یہ تھا کہ قومی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک جگہ لگانہ جماعت ہے جو ہندوؤں سے بالکل الگ ہے۔ یہ ”عذر کے بعد مسلمانوں کی پہلی آواز“ تھی جو ایک قوم کی حیثیت سے بلند ہوئی تھی اور اس میں صاف صاف قومی انفرادیت پر زور دیا گیا تھا۔“ (۲۴)

یہ اقتباس مصنف کی کتاب کے باب بعنوان ”دو قوموں کا نظریہ“ سے نقل کیا گیا ہے۔ کتاب ۱۹۴۶ء میں تصنیف ہوئی۔ پورے باب میں سر سید کا کہیں ذکر نہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جب علیگ طبقے نے تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے شعبوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے دو قومی نظریے کو سر سید سے منسوب کرنے کی فکر کی تروجہ کی تو مصنف موصوف بھی اس پروپیگنڈے کے زیر اثر آگئے اور اپنی پچھلی تحریر کو فراموش کرتے ہوئے اپنی مرتب کردہ کتاب ”خطبات قائد اعظم“ میں یوں پلٹا کھپا :

”دو قومی نظریہ کے اصل ماسر مبدع احمد خان ہیں۔ ان کے بابا بزرگوں اور بیانات میں اعلان کیا کہ مسلمان

ایک جداگانہ قوم ہیں اور وہ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں۔ درحقیقت پاکستان کی خشتِ اول یہی تھی۔“ (۲۵)

دونوں تحریروں کا موازنہ کیجئے کہ موصوف کس طرح خود بیان کردہ ”عذر کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی پہلی آواز“ کا گلا گھونٹ کر انیسویں صدی میں جا پہنچے اور سر سید کے بیانات کو جداگانہ قومیت یا قومی انفرادیت کی بنیاد قرار دے دیا۔ دراصل پروپیگنڈہ بڑی طاقتور شے ہے جو بڑے بڑوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔

غلام احمد پرویز :

ایک فریق سے بے مبالغہ اندھی عقیدت اور دوسرے سے نفرت اور دشمنی کی انتہا کا جذبہ بعض افراد ان کے ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ اس کیفیت میں سچ قبول کرنا ان کے بس میں نہیں رہتا۔ حقائق ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں یا پھر وہ انہیں ارادنا جاننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی معلومات کا حدود اربعہ مضحکہ خیز حد تک کم ہو جاتا ہے۔ جب بات کرتے ہیں تو دوسروں کے الفاظ کو اپنے جذبات کی شدت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ اس کا عکس سر سید کے بیشتر دینی عقائد کے علمبردار غلام احمد پرویز کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

”جوں جوں سر سید اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا تھا مولوی صاحبان کی مخالفت شدید سے شدید تر ہوتی جاتی تھی۔ جب انکے کفر کے فتوے اور جھوٹا پروپیگنڈہ کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے اس کیخلاف ایک منظم عملی قدم اٹھایا اور علیگڑھ کے بالمقابل ایک دارالعلوم (دیوبند) قائم کر دیا۔“ (۲۶)

محض ”مولوی صاحبان“ سے اپنی نظریاتی چپقلش کے زیر اثر موصوف نے کم علمی کا ثبوت دیا اور انہیں یاد نہ رہا کہ دارالعلوم دیوبند علی گڑھ کالج کے قیام سے قبل ہی موجود تھا۔ ان کے اپنے مدوح سر سید کے بقول علی گڑھ میں ”۲۳ مئی ۱۸۷۵ء روز سالگرہ ملکہ معظمہ..... مدرسہ کھولا گیا۔“ (۲۷) جبکہ دیوبند کا مدرسہ ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا تھا۔ (۲۸) جولائی ۱۸۶۷ء کے اخبار سائنٹیفک سوسائٹی میں سر سید نے خود اس کی پہلی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ تحریر کیا۔ (۲۹) پھر جولائی ۱۸۷۳ء میں اس کی ایک اور سالانہ رپورٹ پر ان کا ایک طویل تبصرہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا جس میں انہوں نے علما کو جی بھر کر لتاڑا اور اسلامی مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم پر کڑے الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ (۳۰)

ردِ قہقہل کے طور پر سر سید کے خلاف جو استفتائے شائع ہوا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کے ارشاد کے برعکس علیگڑھ کالج مدرسہ دیوبند وغیرہ کے ”بالمقابل“ قائم کیا گیا ہے۔ اسکی متعلقہ عبارت ملاحظہ فرمائیں :-

”کیا فرماتے ہیں علمائے دین؟“ اس امر میں کہ ان دونوں ایک شخص ہیں ان مدرسوں کو جن میں علوم دینی اور ان علوم کی جو دین کی تائید میں ہیں تعلیم ہوتے ہیں جیسے مدرسہ اسلامیہ دیوبند اور مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ اور مدرسہ اسلامیہ کانپور ان کو دیکھنا ہے

”بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا میل ہے، بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کا یاد اور کیا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں، پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغایرت نہیں ہے۔ جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاسکتے ہیں۔ ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلسن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اسکی خوبصورتی اس میں ہے کہ اسکی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلسن بھیجی ہو جائیگی۔ اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آگئی ہیں، جو کہ مسلمانوں میں زیادہ تر محبت، زیادہ تر اخلاص، زیادہ تر ایک دوسرے کی امداد و ہتھی جائے اور ایک دوسرے کو مکمل ایک بھائی نے سمجھیں، کیونکہ ہم وطن بھائی ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں اسی

قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے..... ہم نے سنا ہے کہ بریلی میں ہندو مسلمانوں نے نہایت خوبی سے ایک دوسرے کی محبت کا ثبوت دیا ہے یعنی بقر عید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی... ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا اسکے کرنے سے بڑا درجہ بہتر ہے۔“ (۳۵)

ڈاکٹر سید معین الحق :

ہمارے بعض قلم کاروں کا یہ المیہ ہے کہ وہ جہاں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ذکر میں قومی جذبات کے مطابق غلط یا صحیح کی درست نشان دہی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہاں جب سر سید کا معاملہ ہو تو موصوف کے عوام دشمن نظریات و اقدامات سے اختلاف کرتے ہوئے بھی ان کے حق میں جوازات تلاش کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ وہ اس مقصد کیلئے غلط بیانی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں قومی جذبات کی ترجمانی کا لہجہ صرف اور صرف اس لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ قارئین کو اچھاتا ثر دے کر انہیں نفسیاتی طور پر سر سید کے دفاع کے حق میں تیار کیا جائے۔ یہ طریقہ واردات سر سید کے شیدائی قلم کاروں کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس کا عکس ڈاکٹر معین الحق کی مندرجہ ذیل تحریر میں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

”انقلاب کے وقت سید احمد خان کی عمر چالیس سال تھی اور ان کی حیثیت ایک سرکاری ملازم سے زیادہ نہ تھی۔ اس وقت ان کے سامنے اصلاحی پروگرام کا بھی کوئی منصوبہ نہ تھا اس لئے یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ سید احمد خان کسی سیاسی مصلحت یا منصوبہ کے تحت نہیں بلکہ حقیقتاً یہ سمجھتے تھے کہ انقلاب دراصل انقلاب نہیں بلکہ ”بغوت“ ہے۔ انقلابیوں کی شکست اور اس کے بعد مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے ان کو اس عقیدہ میں اور بھی پختہ کر دیا۔ چنانچہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کا یہ عقیدہ پختہ تر ہوتا گیا۔ کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ”بغوت“ اور ”عذر“ سے زیادہ کچھ نہ تھا۔“

”اس میں شک نہیں کہ آج ہماری رائے میں سید احمد خان کا یہ عقیدہ اور اسکی بنا پر انہوں نے جو ردیہ اختیار کیا، یقیناً غلط ہے لیکن حیثیت ایک مورخ کے ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی غلط اجتہادی تھی اس کے پیچھے کوئی ذاتی غرض یا مقصد نہ تھا۔ سید احمد خان کا جذبہ ایثار بے مثال تھا۔ جنگ آزادی کے اختتام پر حکومت نے انکی وفاداری کے سلسلہ میں انکو پنشن کے علاوہ ایک جاگیر بھی عطا کرنے کا ارادہ کیا لیکن ماٹھوں نے پنشن کو قبول کر لی مگر جاگیر نہیں لی اس وجہ سے کہ یہ جاگیر ایک باعزت مسلم خاندان کی ضبط شدہ جائیداد تھی۔ سید احمد خان کے اس ایثار کا مورخ تذکرہ تو کرتے ہیں، لیکن اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے اسکی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انکی وفاداری کا رویہ کسی غرض یا فائدہ کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ انکی یہ ایمان داری کی رائے تھی اگرچہ غلط تھی۔ بہر حال سید احمد خان اس انقلاب کو بغاوت ہی سمجھتے تھے اور ہمیشہ ان کا یہی خیال رہا اس رائے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اسکے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین کر لیتا چاہیے کہ سید احمد خان کے خیال میں جن مسلمانوں نے اس انقلاب میں حصہ لیا انہوں نے سخت غلطی کی۔ وہ انکی قربانیوں کو قدر کی نہیں بلکہ افسوس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو مسلمانوں کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور یہ ہی سبب ہے کہ ان پر نہایت سخت اور بعض اوقات ناروا الفاظ میں تنقید کرتے ہیں مثلاً محمود خان کو جو جہور کے انقلابی رہنما تھے وہ ”نامحمود“ کہتے ہیں اسی طرح بہادر شاہ ظفر کا ذکر انہوں نے بہت برے الفاظ میں کیا ہے۔“ (۳۶)

صاحب تحریر کا یہ بیان کہ ”حکومت نے ان کی وفاداری کے سلسلہ میں ان کو پنشن کے علاوہ ایک جاگیر

بھی عطا کرنے کا ارادہ کیا لیکن انہوں نے پنشن تو قبول کر لی مگر جاگیر نہیں لی۔ سر سید کو اس امر میں قوم کا خیر خواہ ظاہر کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ اول تو جاگیر ”عطا کرنے“ کے الفاظ بالواسطہ طور پر فرنگی اقدامات کی تکریم میں قلم کار کے ذہن کی عکاسی کرتے ہیں جب کہ پنشن کے ”علاوہ“ جاگیر پیش کرنے کے ارادے کا ذکر قطعی غلط ہے۔ سر سید کا قد کاٹھ بلند کرنے کی اس ”کہانی“ کو انہوں نے اگلے صفحات میں یوں بیان کیا ہے :

”جنگ آزادی کے دوران سید احمد خان نے حکومت کی جو خدمات انجام دی تھیں انکے صلہ میں پنشن کے علاوہ ٹیکسز یہ چاہتے تھے کہ چاند پور کے علاقے میں ایک جاگیر کیلئے بھی سفارش کریں لیکن سید احمد خان نے منع کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک مسلمان بھائی کی ضبط شدہ جائیداد میں سے انعامی جاگیر قبول کریں۔ مصلحتاً انہوں نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ ہندوستان میں قیام نہیں کرنا چاہتے۔“ (۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ سر سید نے مصلحتاً کوئی بہانہ نہیں کیا۔ سر سید کے خود اپنے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ جاگیر کی پیشکش کے جواب میں وہ اپنے رد عمل کا اظہار یوں کرتے ہیں :

”میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل عجبات تھی۔“ (۳۸)

لطف کی بات یہ ہے کہ خود صاحب سر سید کو ایک دوسرے پہلو سے بلند قامت بنانے کے لئے اپنے ہی بیان کے برعکس اس طرح تحریر کرتے ہیں :

”مسلمانوں کی تباہی سید احمد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اس کا اثر انکے دل پر اس قدر زیادہ ہوا کہ ایک موقع پر جلا وطنی اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن بعد میں اس ارادہ کو ترک کر کے قوم کو تباہی سے چھانے کی کوشش کرنے کی طرف توجہ کی۔“ (۳۹)

یعنی محض سر سید کو ہر لحاظ سے عظیم بنانے کے لئے دو متضاد پہلوؤں میں تعریف و توصیف کی گنجائش نکال لی گئی۔ یہ فن شخصیت پرستی کی خالص پیداوار ہے۔

جہاں تک پنشن کا تعلق ہے تو دراصل سر سید کے ارادہ ترک وطن کو مد نظر رکھتے ہوئے جاگیر کی پیشکش قبول نہ کرنے کے عوض اس کی معقول مقدار متعین کی گئی۔ کلکٹر و مجسٹریٹ بجور کی سرکاری رپورٹ سے اس کی توضیح یوں ہوتی ہے۔

”مناسب ہے کہ پنشن دو سو روپے ماہواری ’خواہ دائمی‘ ہو خواہ حین حیات انکے اور انکے بیٹے کے سرکار سے عنایت ہو۔ اور یہ تجویز اس نظر سے ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ سید احمد خان کا ارادہ ہے کہ بعد چند سال کے سیر اقلیم کی کریں اس سبب سے زمینداری لینا منظور نہیں۔“ (۴۰)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دو نسلوں تک دو سو روپے ماہواری پنشن کی مقدار جو اپنے زمانے میں بلاشبہ ایک ”جاگیر دارانہ پنشن“ تھی سر سید کو جاگیر وصول نہ کرنے کی عوض منظور کی گئی لہذا ”باعزت مسلم خاندان کی ضبط شدہ جائیداد“ پیشکش کو قوم کی غمخواری میں ٹھکرا دینے کے افسانے قارئین کو محض گمراہ کرنے کی سازشیں ہیں۔

متذکرہ بالا بحث میں ہم نے ملاحظہ کیا کہ اول سر سید کی مبینہ ”خدمات“ کو بے غرض ظاہر کرنے کیلئے ان سے ”مصلحتاً ترک وطن کے بہانے“ کی آڑ میں جاگیر ٹھکرائی گئی جبکہ صورت دوم میں ترک وطن کے ارادہ کا بہانہ یاد نہ رہا تو ”قوم کو تباہی سے بچانے کی خاطر“ ان سے جلا وطنی کے ارادے کو ترک کروانا پڑا۔ شاید دانشوری کا نام ہے کہ اپنی دانش کے زور سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ دکھایا جائے۔

اشارات

- ۱۔ تفسیر القرآن (۱۹۹۳ء) تعارف صفحہ اول
- ۲۔ حیات جاوید (۱) ص ۸۹
- ۳۔ تفسیر القرآن (۱۹۹۳ء) تعارف صفحہ دوم
- ۴۔ ایضاً صفحہ اول
- ۵۔ نقطہ نظر اسلام آباد (اپریل تا ستمبر) ص ۳۰-۳۱
- ۶۔ القرآن (۱۹۹۸ء) تعارف صفحہ اول
- ۷۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ (جمادی الاول ۱۲۸۹ھ)
- ۸۔ اسباب بغاوت ہند (۱۹۸۵ء) ص ۶۸۔
- ۹۔ ایضاً (۱۹۹۱ء) ص ۶۸
- ۱۰۔ ایضاً (۱۹۵۸ء) ص ۳
- ۱۱۔ ایضاً (۱۹۸۵ء) ص ۶۸
- ۱۲۔ مقالات یوم شہیل ص ۶۹
- ۱۳۔ خطبات احمدیہ ص ۳۵۲
- ۱۴۔ تذکرہ اہل دہلی ص ۳۰
- ۱۵۔ حیات جاوید (۲) ص ۱۳
- ۱۶۔ اردو کی علمی ترقی میں سر سید ص ۶۳
- ۱۷۔ حیات جاوید (۲) ص ۳۲۰
- ۱۸۔ ایڈریس اور اسپینچین ص ۷۲
- ۱۹۔ مکمل مجموعہ لکچرز ص ۲۴
- ۲۰۔ سرکشی ضلع جہور ص ۱۴۱
- ۲۱۔ اردو کی علمی ترقی میں سر سید ص ۷۵
- ۲۲۔ ایضاً ص ۷۶-۷۷
- ۲۳۔ حیات محمد علی جناح ص ۵۳۸-۵۳۹
- ۲۴۔ خطبات قائد اعظم ص ۵۶۷
- ۲۵۔ تہذیب کراچی (نومبر ۱۹۹۸ء) ص ۲۰
- ۲۶۔ مکمل مجموعہ لکچرز ص ۴۰۵
- ۲۷۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۱۵۵
- ۲۸۔ تحریک علی گڑھ تاقیام پاکستان ص ۶۸
- ۲۹۔ مقالات سر سید (۷) ص ۷۸
- ۳۰۔ سر سید احمد خان (سیاسی مطالعہ) ص ۱۳۴
- ۳۱۔ قائد اعظم کا تصور پاکستان ص ۱۹
- ۳۲۔ تہذیب کراچی (نومبر ۱۹۹۸ء) ص ۱۷
- ۳۳۔ سر سید علیہ الرحمہ ص ۷۵
- ۳۴۔ آخری مضامین ص ۵۵
- ۳۵۔ سرکشی ضلع جہور (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) ص ۲۳ تا ۲۱
- ۳۶۔ ایضاً ص ۳۵
- ۳۷۔ مکمل مجموعہ لکچرز ص ۳۹۹
- ۳۸۔ سرکشی ضلع جہور (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) ص ۱۰۵
- ۳۹۔ لائل محمد زائف انڈیا (۱) ص ۵۵